عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی!!

ادارہ اشرفیہ عزیزیہ کا ترجمان

ماہنامہ غزالی

ذوالقعدہ ۱۴۲۳ھ / جنوری ۲۰۰۳ء

فہرست

فی شمارہ: ۱۵ روپے۔

سالانہ بدل اشتراک: ۱۴۰ روپے + ڈاک خرچ

خط و کتابت کا پتہ: مکان p-12 یونیورسٹی کیمپس پشاور۔

جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا سانحہ ارتحال

یہ ۱۴۰۰ھ بمطابق ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ کی بات ہے کہ بندہ کے شیخ و مربی حضرت مولانا محمد اشرف صاحبؒ نے فرمایا کہ پشاور یونیورسٹی نے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو حضورﷺ کے غزوات پر لیکچر دینے کی دعوت دی ہے۔حضرت نے بیان میں شمولیت کی تاکید فرمائی۔ بندہ نے پہلی دفعہ نام سنا تھا، تعارف نہیں تھا۔حضرت نے فرمایا کہ موصوف مایہ ناز محقق ہیں اور اُن کا تحقیقاتی مقام آج کل کی دنیائے مغرب کی مشہور و معروف یونیورسٹیوں کے اسلامی علوم کے بڑے بڑے ماہرین سے کہیں آگے ہے۔اورانھوں نے ساری دنیا مین اپنا لوہا منوایا ہوا ہے۔حضرت نے مزید فرمایا کہ موصوف جنوبی ہند کے رہنے والے ہیں اور وہاں کے قادریہ خانوادہ میں محمد حسین نامی قادری بزرگ کے خلیفہ بھی ہیں۔عرصہ دراز سے فرانس میں مقیم ہیں اور ایک اسلامک سینٹر چلا رہے ہیں۔تحقیقات اور اسلام کی نشر و اشاعت میں اسقدر محویت ہے کہ ساری عمر شادی نہیں کی۔سکون باطن کی خاطر گوشت، انڈا اور مچھلی سے پرہیز رکھا ہے (الّا یہ کہ اتباع سنت میں کبھی استعمال ہو)۔ معاصر اخبارات و رسائل نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ڈی۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کا تذکرہ لکھا ہے لیکن مذکورہ بالا حقائق بندہ کی نظر سے کہیں نہیں گذرے۔

تقریر والے دن بندہ پشاور یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں پہنچ گیا۔ایک کمزور بدن بزرگ، مکمل باشرع صورت بیان فرمانے کے لیے ڈائیس پر کھڑے ہوئے۔ہمارے تصوف کے سلسلے والے فقراء میں سے کسی نے بعد میں فرمایا کہ موصوف کا باطن کبر، حسد، لالچ، ریا، کینہ وغیرہ کے رذائل سے بالکل پاک تھا اور فضائل سے متصف تھا۔ڈاکٹر صاحب نے دھیمے لہجے سے تقریر شروع فرمائی اور تورات و انجیل کے تناظر سے قتال و جہاد

پر بحث فرمائی۔ یہود و نصاریٰ کا مؤقف اور ان کے مظالم کو بیان کر کے حضور ﷺ کے کچھ غزوات کے واقعات بیان فرمائے۔ نہ خطیبانہ جوش وخروش، نہ شاعرانہ قافیہ بندی اور نہ ہی ادیبانہ رنگ آمیزی تھی۔ بندہ بذات خود نیم مولوی و نیم خطیب نیز کالج، یونیورسٹی کا ڈیبیٹر ہونے کی وجہ سے ذرا دلبرداشتہ ہوا کہ وقت ہی ضائع ہوا، اتنی باتیں تو ہم بھی کر سکتے تھے۔ لیکن جس وقت ڈاکٹر صاحب نے اسلام اور یہودیت و نصرانیت کا تقابل کر کے حضور ﷺ کی جہادی ترتیبوں کے مصالح اور راز و نکات کھولے تو معلوم ہوا کہ خطیبانہ جوش وخروش اور شاعرانہ و ادیبانہ رنگ آمیزیاں تو کچھ اور چیز ہیں اور حق و باطل کو دلائل سے آشکارا کرنا کچھ اور چیز ہے۔ خطیبانہ و شاعرانہ ترتیبیں تو دل کو وقتی طور پر ہلا دیتی ہیں، لیکن احقاق حق کے دلائل عقل کو چکرا دیتے ہیں اور حق کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

بہرحال یہ تقریر بندہ کے لیے سرمایہ حیات بنی۔ اب بھی بندہ مختلف مواقع پر جب قتال کو بیان کرنا ہو تو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی مذکورہ تقریر ہی بول لیتا ہے، جس پر مجمع بھی عش عش کر اٹھتا ہے اور مجمع کے سامنے ہماری کم علمی پر پردہ پڑ جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو کفر کے تاریک ماحول میں کام کرنا پڑا، جہاں کفر و الحاد کے انتہائی ٹیڑھے ذہنوں کے سامنے بات پیش کرنا ہوتی تھی۔ اس تگ و دو میں کچھ باتیں ڈاکٹر صاحب کے تفردات بھی ہیں، لیکن یہ اصول ہے کہ مفتی اپنے علم کو پوری کوشش سے استعمال کرے اور نیت میں دیانت ہو تو مفتی خاطی کو بھی ایک اجر ملتا ہے، جبکہ مصیب کے لیے دو اجر ہیں۔

اللہ تعالیٰ موصوف کے درجات بلند فرمائے اور محققین کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت مولانا اشرف خانؒ
ضبط کردہ: پروفیسر شیر حسن

بیان مولانا اشرف صاحب

سوال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تبلیغ کس طرح تھی؟

جواب: جتنے بھی انبیاء علیھم السّلام اس دنیا میں تشریف لائے ہیں سب کے سب نے تبلیغ کا کام کیا ہے، یعنی دین کو لوگوں تک پہنچایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کے دو دور ہیں ایک مکی دور ہے اور دوسرا مدنی دور ہے۔ آپ سیّد الرسل اور سید الانبیاء ہیں۔ آپ کی دعوت میں حکمت ہر رخ کی پائی جاتی تھی۔ انبیاء علیہ السّلام **و ما علینا الا البلاغ** کو اتنا پورا کرتے تھے اور اس کا حق ادا کرتے تھے کہ جس کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق آتا ہے **اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّ نَهَارًا** (میں بلاتا رہا اپنی قوم کو رات اور دن)۔ ۹۵۰ سال تک حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا سلسلہ چلتا رہا۔ انبیاء کی دعوت کا منشاء امر الٰہی اور شفقت علی الناس تھا۔ ان کے قلوب میں تڑپ اور کڑھن ہوا کرتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی کڑھن اور بے چینی کے متعلق قرآن میں کئی جگہ پر اللہ تعالیٰ نے آیات اتاری ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی نہیں چاہتے تھے کہ آپ اس غم میں کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اپنے کو گھلا دیں۔

فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا۔ (الکھف)

ترجمہ: سو کہیں تو گھونٹ ڈالے گا اپنی جان کو ان کے پیچھے اگر وہ نہ مانیں گے اس بات کو پچتا پچتا کر۔

وَاصْبِرْ وَمَاصَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْهِمْ وَلَاتَکُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْکُرُوْنَ (النحل۔۱۲۷)

ترجمہ: اور تو صبر کر اور تجھ سے صبر ہو سکے اللہ کی مدد سے اور ان پر غم نہ کھا اور تنگ نہ ہو ان کے فریب سے۔

ان آیات سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ آپ کا سینہ مبارک ہر وقت ایک قسم کی گھلنے کی کیفیت میں ہوتا تھا۔ تمام انبیاء علیہم السلام کو اور خصوصاً حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار نے مجنون اور ساحر تک کہا تھا۔ مکہ کی زندگی میں سب سے پہلے قرآن پاک کا نزول ہوا۔ نبی اس لیے آتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیں اور لوگوں کو کفر کی تاریکی سے نکالیں اور نور ھدایت پر ڈال دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے ہر انفرادی پہلو کو پہلے خود اختیار کیا اور پھر اس ذمہ داری کو صحابہ پر ڈالا۔ جب آپ کو نبوت ملی تو نبوت کی ذمہ داری کا آپؐ پر بہت بوجھ تھا۔ قرآن نے بھی اس بوجھ کے متعلق کہا ہے کہ

اَنۡقَضَ ظَهۡرَكَ (جھکا دی تھی پیٹھ تیری)

جتنا کسی کو اس کی بیوی جانتی ہے اتنا کوئی اور نہیں جانتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی اتری اور آپؐ غار حرا سے گھر تشریف لائے تو آپ کانپ رہے تھے اور آپؐ کو سردی لگ رہی تھی آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کو جو آپ کی بیوی تھیں فرمایا کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتہ آیا ہے اور مجھے اپنی ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ خدا کی قسم خدا آپ کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں، مقروضوں کا بار اٹھاتے ہیں غریبوں کی اعانت کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، حق کی حمایت کرتے ہیں مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔ پھر آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو تورات وانجیل کے عالم تھے، اس نے کہا کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اترا تھا۔

عورتوں میں سب سے پہلے آپ کی بیوی حضرت خدیجۃ الکبریٰ آپ پر ایمان

لے آئیں، پھر اس کے بعد مردوں میں آپ کے قریبی دوست حضرت ابوبکرؓ نے اسلام قبول کیا جن کی صحابیت پر قرآن گواہ ہے۔ ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ (وہ دوسرا تھا دو میں کا جب وہ دونوں تھے غار میں۔

اقبال نے حضرت ابوبکرؓ کے متعلق کہا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اسلام کا بھی ثانی ہے، غار کا بھی ثانی ہے، بدر کا بھی ثانی ہے اور قبر کا بھی ثانی ہے۔ چونکہ حضرت ابوبکرؓ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت اچھی طرح جانتے تھے تو بغیر کسی چوں چراں یا کسی توقف یا سوال کے ایمان لے آئے۔ حضرت زیدؓ آپ کے ملازم تھے، غلام تھے، منہ بولے بیٹے تھے انھوں نے بھی ایمان قبول کیا۔ بچوں میں آپ کے عم زاد حضرت علیؓ ایمان لے آئے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انفرادی دعوت کی مثالیں ہیں۔

وحی کی وجہ سے آپ پر رعشہ طاری ہوا آپ کو سردی لگ رہی تھی آپ نے حضرت خدیجہؓ سے فرمایا زَمِّلُوْنِیْ زَمِّلُوْنِیْ (مجھے کمبل اوڑھادے) دَثِّرُوْنِیْ دَثِّرُوْنِیْ (مجھے کپڑا اوڑھادے) اس حالت میں دوسری وحی آئی،

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ. قُمْ فَاَنْذِرْ (اے لحاف میں لپٹنے والے کھڑا ہو پھر ڈر سنادے)

اردو محاورہ میں انذر کے معنی ہوشیار کرنا، متنبہ کرنا، آگاہ کرنا کے ہیں۔ یعنی اے محمدؐ آپ اٹھ جایئے۔ دعوت اس لیے نہیں کہ آپ لیٹ جائیں۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے لیے کمر باندھ لی اور دعوت شروع کی۔ جس نے بھی حضورؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا پورے طور پر اسی وقت اس پر دعوت کا جذبہ طاری ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر عشرہ مبشرہ کے چھ صحابہ حضرت عثمانؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ ایمان لے آئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ تجارت کیا کرتے تھے۔ تاجر حضرات جوڑنا توڑنا بہت اچھی طرح جانتے ہیں اس

لیے دعوت کا کام اچھے طریقے سے کر سکتے ہیں۔ انڈونیشیا میں پورا اسلام تاجروں کے ذریعے سے پھیلا ہے۔ دوسری ترکیب آپ نے یہ چلائی کہ رشتہ داروں کی دعوت کی جس میں ابولہب آپ کا چچا بھی تھا۔ عربوں میں یہ دستور تھا کہ جب ایک آدمی بات شروع کر لیتا تھا تو جب تک وہ بات ختم نہ کرتا دوسرا آدمی بات شروع نہیں کرتا تھا۔ پہلے دن ابولہب بھانپ گیا کہ حضورؐ نے ہمیں کس لیے بلایا ہے اس لیے بہت لمبی بات شروع کی، اس طرح دعوت کا وقت ختم ہو گیا اور حضور کو اپنی بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ دوسرے دن پھر حضورؐ نے دعوت کی اور پھر وہی پہلے دن والی نوعیت رہی۔ تیسرے دن پھر حضورؐ نے دعوت کی تو آپ کو بات کرنے کا موقع ملا۔ پوری مجلس میں صرف ایک حضرت علیؓ اٹھے اور کہا کہ اے میرے چچا کے بیٹے! گو کہ میں چھوٹا ہوں لیکن میں دین کی خاطر ہر قربانی کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں۔ جب وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ (اور ڈر سنا دے اپنے قریب کے رشتہ داروں کو) نازل ہوئی تو آپؐ صفا کی پہاڑی پر چڑھے اور قبائل کو اکٹھا کیا اور ارشاد فرمایا کہ دیکھو اگر میں یہ کہوں کہ صفا کی پہاڑی کی پشت سے ایک لشکر آپ لوگوں پر حملے کے لیے آ رہا ہے تو کیا تم لوگ میری بات کا یقین کرو گے؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ کیوں نہیں کریں گے آپ صادق اور امین ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ میری مثال اس وقت ننگے ڈرانے والے کی ہے (نذیر العریان) کی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ آپ لوگوں کو شدید عذاب سے ڈرانے والا ہوں اگر آپ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ ابولہب نے کہا آپ کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں (نعوذ باللہ) اسی لیے تم نے ہم کو اکٹھا کیا ہے۔ اس کے جواب میں سورہ تبت نازل ہوئی۔

حضورؐ کا صفا کی پہاڑی پر چڑھنے کا مطلب یہ تھا کہ جیسے میں پہاڑی کے دونوں طرف دیکھ رہا ہوں اور تم لوگ پہاڑی کے اُس طرف کچھ نہیں دیکھ سکتے، اسی طرح

تم کو صرف اس دنیا کی زندگی نظر آرہی ہے اور آخرت کی زندگی سے آپ لوگ بے خبر ہیں ۔مجھ پر اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت کے دونوں عالموں کو کھولا ہے ۔اس کے بعد لوگ انفرادی طور پر مسلمان ہونے لگے ۔حضرت عمارؓ اور ان کے والد حضرت یاسرؓ اور والدہ حضرت سمیہؓ مسلمان ہوگئے ۔بڑوں میں حضرت ارقم بن ارقم مسلمان ہوگئے ۔اب کفار مکہ نے ایسی ایسی تکالیف مسلمانوں کو دینی شروع کیں جن کو انسان بیان نہیں کر سکتا ، خصوصاً جو غریب صحابہ تھے ان کو کوڑوں سے مارتے تھے ، آگ پر ڈالتے تھے ، ریت پر گھسیٹتے تھے ، اونٹ کی مشکوں میں بند کر دیتے تا کہ دم گھٹ جائے ۔لیکن اسلام کا نشہ اترنے والا نہیں تھا ۔حضورؐ جس سے بھی ملتے ان کو اللہ کی طرف بلاتے اور کلمہ کی دعوت دیتے ۔حضورؐ کے پاس جنات کا بھی ایک گروہ آیا ، آپؐ نے ان کو دعوت دی اور وہ ایمان لے آئے اور داعی الی اللہ بن گئے ۔قرآن میں سورہ جن میں اس کا تذکرہ ہے ۔صحابہ کرام میں یہ بات تھی کہ جب ایمان لاتے تو اپنے اخلاق اور معاملات کو درست کرتے اور راتوں کو پوری پوری رات نماز میں مشغول ہوتے ۔ہجرت کے بعد جو نماز فرض ہوئی ہے وہ پنج وقتہ نمازیں تھیں ، ورنہ نماز شروع سے ہی فرض ہوگئی تھی ۔بڑے بڑے صحابہ کو بھی پیٹا گیا ۔حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جوتوں سے منہ پر مارا گیا ، حضرت عثمانؓ کو ان کے چچا نے چٹائی میں لپیٹ دیا اور پھر دھواں دیا ۔غریبوں کا تو حال ہی نہ پوچھو ۔یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک کو اذیتیں دی گئیں ۔حضرت حمزہؓ جو حضورؐ کے چچا تھے کا واقعہ ہے کہ وہ شکار کے لیے گئے تھے ، جب شکار سے واپس ہوئے تو معلوم ہوا کہ ابوجہل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخی کی ہے اور دیکھا کہ حضورؐ کا سر پھٹا ہوا ہے ۔سیدھے گئے اور کمان کو ابوجہل کے سر پر مارا اور اس کا سر پھوڑ دیا ۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے ہیں اور آپؐ کو بتاتے ہیں کہ میں نے آپ کا بدلہ ابوجہل سے لے لیا ۔حضور ﷺ نے فرمایا کہ

چچا جان میں تو تب خوش ہوں گا جب آپ ایمان لے آئیں۔ حضرت حمزہؓ نے اسلام قبول کر لیا۔ حضور ﷺ ارقم بن ارقم کے مکان پر تشریف رکھے ہوئے تھے۔ ارقمؓ کا مکان مسلمانوں کا دارالشوریٰ تھا ارقمؓ رؤسا میں سے تھے اور بنی مخزوم کے خاندان سے تھے۔ رؤساء پر کفار مکہ کا زیادہ زور نہ چلتا تھا اور نہ ان پر غریب مسلمانوں کی طرح ظلم اور زیادتی کرتے تھے اور نہ ان کے گھروں کو جلاتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ اسلام کو دو عمروں (حضرت عمر بن خطاب اور عمر بن ہشام) میں سے کسی ایک کے اسلام لانے سے غلبہ عطا فرما۔ حضرت عمرؓ کے اسلام کا واقعہ آپ نے سنا ہوگا۔ تلوار لے کر ارقمؓ کے گھر کو جارہے تھے کہ نعوذ باللہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کریں۔ راستے میں کسی نے کہا کہ عمر کہاں جارہے ہو؟ کہا کہ حضرت محمد ﷺ کے قتل کے ارادے سے جارہا ہوں۔ اس نے کہا کہ پہلے اپنے گھر کہ خبر لے لو، آپ کی ہمشیرہ اور بہنوئی دونوں مسلمان ہو چکے ہیں۔ حضرت عمرؓ غصہ سے آگ بگولہ ہوگئے، پہلے اپنی ہمشیرہ کے گھر گئے، گھر کا دروازہ بند تھا اور اندر آپ کی ہمشیرہ اور بہنوئی قرآن پڑھ رہے تھے۔ آپ نے دروازہ کھٹکھٹایا، انھوں نے آپ کے ڈر سے قرآن کے اوراق چھپا دیے اور پھر دروازہ کھولا۔ آپ اندر داخل ہوئے اور ہمشیرہ اور بہنوئی کو مارنا شروع کیا۔ ہمشیرہ کی زبان سے نامِ حق، آنکھ سے آنسو اور بدن سے خون جاری تھا، کہنے لگیں اے عمر! جتنا مار سکتے ہو مارو ایمان ہمارے دلوں میں راسخ ہو چکا ہے۔ اس بات کا حضرت عمرؓ پر اثر ہوا اور کہا کہ تم جس چیز کی تلاوت کر رہے تھے وہ مجھے دکھاؤ۔ بہن نے کہا کہ آپ ناپاک ہیں ہم آپ کو قرآن کے اوراق نہیں دے سکتے۔ حضرت عمر نے غسل کیا بہن نے قرآن سنایا، ایک روایت کے مطابق سورہ طٰہٰ کی آیتیں اور ایک روایت کے مطابق سورہ حدید کی آیات تھیں۔ دل پر چوٹ لگی اور سیدھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالیہ میں ارقمؓ کے مکان پر پہنچے اور

وہاں پر اسلام لے آئے۔ پھر سیدھے جا کر کعبۃ اللہ میں نماز پڑھی۔ آپ کے ایمان لانے کی وجہ سے مسلمانوں کو بہت ڈھارس ہوئی اور باقی مسلمانوں نے بھی کعبۃ اللہ میں نماز پڑھنی شروع کی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایمان لے آئے، کعبۃ اللہ میں جا کر لا الہ الا اللہ پڑھا، کفار مکہ نے خوب پٹائی کی، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی کعبۃ اللہ میں نماز پڑھی تو آپ کو لہولہان کیا گیا۔ آپ بیہوش ہو گئے، رات گئے آپ کو ہوش آیا۔

حجاز میں مختلف منڈیاں لگتی تھیں جس میں عکاظ اور ذوالمجاز کی منڈیاں بہت مشہور تھیں۔ لوگ دور دور سے ان منڈیوں میں تجارت کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ حضور ﷺ ان منڈیوں میں بھی جایا کرتے تھے اور وہاں پر لوگوں کو اسلام اور ایمان کی دعوت دیتے۔ عرب کے لوگ زمانہ جاہلیت میں بھی حج کرتے تھے۔ مرد اور عورتیں ننگے حج کرتے تھے۔ البتہ قریش کی عورتوں پر کپڑا ہوتا تھا۔ حضور ﷺ حج کے موقع پر بھی لوگوں میں دعوت اسلام کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ آپ کے چچا حضرت عباس ایمان نہیں لائے تھے، ان کا وسیع سودی کاروبار تھا اس لیے باہر کے اکثر لوگ آپ کو پہچانتے تھے۔ تعارف کے لیے حضور ﷺ حضرت عباسؓ کو ساتھ لے جاتے تھے۔ کبھی کبھی اکیلے بھی تشریف لے جاتے تھے۔ حضور ﷺ کو جو بھی بوڑھا، جوان، بچہ ملتا آپ اس کو کہتے کہ میں تم کو ایک خیر کا کلمہ نہ بتاؤں؟ جب وہ تیار ہو جاتا تو آپ ﷺ فرماتے **قولو لا الہ الا اللہ تفلحو** (لا الہ الا اللہ کہو تو فلاح پاؤ گے)۔ ایک دفعہ آپ ذوالمجاز کے میلے میں دعوت دے رہے تھے، ایک آدمی آپ کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا اور کہتا تھا کہ یہ (نعوذ باللہ) پاگل ہے۔ یہ آپ کا چچا ابولہب تھا۔ ایک عورت آپ کے راستے میں کانٹے بچھاتی تھی راکھ اور تھوک آپ ﷺ پر ڈالا جاتا تھا، اچانک ایک پتھر آپ ﷺ کے سر کو لگتا ہے، آپ ﷺ زخمی ہو جاتے ہیں اور بیہوش ہو کر گر جاتے ہیں۔ آپ کی بیٹی حضرت زینبؓ یا

حضرت فاطمہؓ آتی ہیں، آپ ﷺ کو پانی کا چھینٹا دیتی ہیں اور کپڑا جلا کر راکھ کو آپ کے سر کے زخم میں بھرتی ہیں۔ آپ ﷺ ہوش میں آتے ہیں، بیٹی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ میری بیٹی غم نہ کر اللہ تعالیٰ اس اسلام کو مغارب اور مشارق الارض تک پہنچائے گا، یہاں تک کہ کوئی جھونپڑا یا پکا مکان ایسا نہ ہوگا جہاں اسلام کی آواز نہ پہنچ جائے گی۔

(باقی آئندہ)

☆☆☆☆☆

حضرت زکریا علیہ السّلام کے حال میں لکھا ہے کہ کسی کی دیوار اجرت پر بناتے تھے دیوار والوں نے آپؑ کو دو روٹیاں لا دیں۔ آپؑ کا دستور تھا کہ بدوں اپنے ہاتھ کی اجرت کے کھانا نہ کھاتے تھے۔ جس وقت آپ کھانے بیٹھے تو کچھ لوگ آپ کے پاس آئے۔ آپ نے ان کی کھانے سے تواضع نہ کی، یہاں تک کہ سب کچھ کھا چکے۔ لوگوں کو آپ کے اس فعل سے تعجب ہوا، اس لیے کہ آپؑ سخی اور زاہد مشہور تھے، اور یہ گمان کیا کہ بظاہر تواضع کر لینا بہتر تھا۔ آپؑ نے فرمایا کہ میں کچھ لوگوں کی مزدوری کرتا ہوں اور انھوں نے مجھے روٹی اس لیے دی تھی کہ ان کا کام کرنے کی طاقت مجھ میں آ جائے۔ پس اگر تم بھی اس کھانے میں شریک ہوتے تو نہ تو تمہارا پیٹ بھرتا اور نہ ہی میرا، اور میں ان کے کام میں ضعیف رہتا۔

عاقل آدمی نور خدا سے اس طرح باطن کو دیکھا کرتا ہے۔ کام میں سستی ہونا فرض کا نقصان ہے اور کھانے کی تواضع نہ کرنا نفل کا نقصان ہے۔ فرائض کے ہوتے ہوئے نوافل کی کچھ پوچھ نہیں۔ (از احیاء العلوم۔ انتخاب نثار احمد)

حضرت ڈاکٹر فدا محمد
ضبط کردہ: ڈاکٹر شاکر

اصلاحی مجلس

ہمارے حضرت مولانا صاحبؒ کے پاس ایک دفعہ ایک آدمی آئے تو جو ساتھی ان کو لے کر آئے تھے انھوں نے کہا کہ بڑے کشف والے ہیں اور ان کو انوارات نظر آتے ہیں۔ لیکن جب مجلس میں آکر بیٹھے تو جو بھی بات کرے اس کی بات کاٹیں۔ حضرت مولانا صاحب نے فرمایا کہ ''خودرو'' ہیں، تربیت یافتہ نہیں ہیں۔ کثرت ذکر سے کشف تو شروع ہو گیا ہے اور انوارات بھی نظر آنے لگے ہیں لیکن جو کامل تربیت یافتہ شخصیت ہوتی ہے وہ نہیں ہے کیونکہ مجلس میں بیٹھ کر بات کرنے کا طریقہ نہیں آتا اور دوسروں کی بات کاٹتے ہیں۔ میں کالج میں جس ڈیپارٹمنٹ کو چلا رہا ہوں وہاں بیس پچیس ڈاکٹر ہوتے ہیں، میرا تجربہ ہے کہ جب میں بات کروں تو بعض ایسے آدمی ہوتے ہیں جو دوسری طرف متوجہ ہوتے ہیں یا آپس میں بحث شروع کر دیتے ہیں یا بات کاٹتے ہیں تو ایسے آدمی کی ترقی نہیں ہوتی۔

میں نے ایک دو امتحان لیے تو میرے کچھ تبلیغی ساتھی ہیں جو پورے باشرع اور نماز و نوافل کے پابند ہیں جبکہ ایک بیچ میں داڑھی منڈا آدمی ہے جو مجلس ذکر میں ہوتا ہے یہ ان سے آگے نکل جاتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ یہ اس کا اپنا آدمی ہے اسلئے اس کو آگے نکالتا ہے، حالانکہ ہم نے فیصلہ تو حق کا کرنا ہوتا ہے، جس کا جو حق ہوتا ہے اس میں تو گڑبڑ نہیں ہو سکتی، اللہ تعالیٰ کو جواب دینا ہے۔ اب اس آدمی کے آداب معاشرت ٹھیک ہیں، یہ اپنے سینئر اور اساتذہ کی آنکھ دیکھ کر چلتا ہے، اس کے مطابق اس کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، بات کرنا سننا وغیرہ سارے آداب کی رعایت کرتا ہے تو یہ قدرتی طور سے آگے نکل جاتا ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ آداب معاشرت کی وجہ سے ہمارا دل اس کے لیے نرم ہو جاتا

ہے بلکہ ایسے آدمی کے لیے اللہ کی طرف سے ایک مدد ہوتی ہے۔

ہمارے ایک پولیس کے افسر تھے، انھوں نے چار مہینے لگا لیے تو کہنے لگے کہ ''ماشاء اللہ پورا یقین حاصل ہوگیا ہے، میں ان سینئر افسروں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا یہ میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں، ان کے ہاتھ میں کیا ہے؟'' تو میں نے ان سے کہا کہ مسئلہ اس طرح نہیں ہے، بلکہ یہ سوچنا ہوتا ہے کہ یہ سینئر افسر ہیں ان کی بات سننا، ان کا احترام کرنا اور محکمانہ امور میں ان کے احکام ماننا ان کا شرعی حق ہے وہ تو میں ادا کروں گا، لیکن یہ میرا کچھ بنا نہیں سکتے، نفع نقصان اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ چاپلوسی تو تب ہوتی جب کوئی دنیا کا مفاد حاصل کرنے کے لیے ان کے آگے تواضع اور آؤ بھگت کا رویہ اختیار کرے۔

حضرت مولانا الیاسؒ ان پڑھ جاہل لوگوں کی منتیں کرتے، ان سے عاجزی سے ملتے، ان کے پاؤں کو ہاتھ لگاتے تو کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ علم کا وقار گرا رہے ہیں تو مولانا الیاسؒ نے فرمایا کہ اللہ کے احسان سے میں یہ دنیا کے مفاد کے لیے نہیں کر رہا، بلکہ ان لوگوں کا دین درست کرنے کے لیے کر رہا ہوں۔

ہمارے صوابی کے ایک بوڑھے آدمی ہیں جو مختلف کاموں کے لیے پشاور آتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی سمجھ دی ہے کہ جب میری کلاس نہیں ہوتی اور میں فارغ ہوتا ہوں اس وقت آتے ہیں، شاید کہیں بیٹھے رہتے ہیں۔ جتنی دیر میں چائے کی پیالی پیتے ہیں اتنی دیر میں ساری بات بھی بتا دیتے ہیں۔ میں ان کے کاموں کے لیے کسی کو مقرر کر دیتا ہوں۔ اگر ظہر کے وقت آنا ہو تو ظہر کی نماز میں موجود ہوتے ہیں، ہمارے ساتھ کھانا کھاتے ہیں اور اس دوران ساری بات بھی بتا دیتے ہیں۔ میں ان کا کچھ نہ کچھ بندوبست کر دیتا ہوں۔ جب وہ گھر پر جاتے ہیں تو بڑی تعریف کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ ان بزرگ کا ہی ایک بیٹا ہے جو مالدار ہے، وہ یہ سوچتا ہے

کہ میں ڈاکٹر صاحب پر کھانے کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ جب ظہر کی نماز پڑھ کر کھانا کھا کر لیٹا اور جوں ہی نیند آئی تو گھنٹی بج گئی۔اب میں معدے کا مریض، اور یہ آرام کا وقت، اگر نیند آتے ہوئے کوئی جگا دے تو سارا دن تکلیف میں گزرتا ہے۔اب اس شخص نے مجھے مالی بوجھ سے تو بچالیا لیکن ذہنی کوفت دی۔اب اس وقت صحیح طرح بات بھی نہیں ہوسکتی، تو یہ ہوشیار آدمی جب گھر جاتا ہے تو کہتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب بڑا خشک آدمی ہے۔

ہمارے ایک ماسٹر صاحب ہیں جنھیں تعویذ گنڈوں کا بہت شوق ہے۔تو وہ ایک پروفیسر صاحب کے پاس دم کرنے کی اجازت لینے چلے گئے۔اور ایسے وقت گئے کہ جب پروفیسر صاحب ڈیوٹی سے تھکے ہوئے آئے اور جونہی کھانا کھا کر آرام کے لیے لیٹے تو اس نے گھنٹی بجادی۔ پروفیسر صاحب نے اس کی ڈانٹ ڈپٹ کی۔ جب وہ میرے پاس آیا تو کہنے لگا کہ وہ تو بڑا بدمزاج آدمی ہے۔ مجھے اس کی عادت کا اندازہ تھا اس لیے میں نے پوچھا کہ دن کو دو بجے یا تین بجے گئے تھے؟ اس نے کہا کہ ہاں۔ میں نے کہا کہ یہ تو اچھا ہوا کہ اس نے تمہاری پٹائی نہیں کی کہ دن بھر کام کرنے کے بعد یہ اس کے آرام کا وقت تھا۔ بعد میں اس ماسٹر صاحب نے بتایا کہ فلاں بزرگ نے خلافت دے دی ہے۔ میں نے کہا کہ بزرگ بھی مزے کرے اور تم بھی مزے کرو۔ صرف چھ لطائف کے چلنے پر خلافت دے دی اور باقی تربیت کا کوئی خیال ہی نہیں کیا۔اب یہ آدمی جہاں بھی اٹھے بیٹھے گا تو لوگ کہیں گے کہ یہ ہیں جی خلیفہ صاحب! ماشاءاللہ کہ اٹھنے بیٹھنے کا فہم ہی نہیں ہے۔

کئی آدمیوں کے دنیا کے کام اس لیے رکے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ آداب معاشرت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ میں نے اپنے ایک بھتیجے سے کپڑے کی دکان کھلوائی تو اس نے پیغام بھیجا کہ دکان نہیں چلتی۔ میں نے پوچھا کہ کیوں نہیں

چلتی؟ تو اس نے کہا کہ مجھ سے لوگوں کی خوشامدیں نہیں ہوتیں، دوسرے دکاندار آنے والوں کو سلام کرتے ہیں، ان کو بٹھاتے ہیں اور چائے وغیرہ کا پوچھتے ہیں۔ ہم سے ایسی خوشامدیں نہیں ہوتیں۔ تو میں نے اس سے کہا کہ اللہ کے بندے جو آدمی تیرے پاس آرہا ہے وہ تو تمہارا مسلمان بھائی ہے، اس کا اعزاز کرنا اور اسے چائے پانی پوچھنا تو اس کا اسلامی حق ہے۔ اگر تیری روزی اس کی جیب سے ہوئی تو اللہ تجھے دلا دے گا ورنہ ثواب تو کہیں نہیں گیا۔

ہمارے بعض ساتھی ہم سے بڑے اچھے طریقے سے ملتے ہیں، ہاتھ چومتے ہیں اور عاجزی کرتے ہیں کہ دیکھنے والے یوں سمجھتے ہیں کہ بڑے متواضع ہیں لیکن اگر باہر کی زندگی میں دیکھیں تو ہر جگہ ناکام، ہر جگہ لڑائی جھگڑا۔ ساتھیوں کو بڑی حیرت ہوتی ہے کہ بڑا اچھا ساتھی ہے، کتنی خدمت کرتا ہے اور کتنی محبت کرتا ہے تو میں ساتھیوں سے کہا کرتا ہوں کہ مجھ سے تو کر رہا ہے لیکن باہر نہیں کرتا۔ ایک عالم نے حضرت تھانویؒ کو خط لکھا کہ فلاں جگہ ہم سے آپ کے حق ادا کرنے میں کوتاہی ہوگئی، حالانکہ آپ میرے شیخ و مربی ہیں، آپ معاف فرمادیجئے۔ تو حضرت تھانویؒ نے جواب میں لکھا کہ آپ ہمارے سلسلے کو نہیں سمجھے۔ ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہر مسلمان کا اپنے ذمے ایسا حق سمجھیں جیسا کہ میرا سمجھتے ہیں۔

ہم تو لوگوں کے بارے میں دل میں بدگمانی کا رویہ لے کر چل رہے ہوتے ہیں اور از روئے حدیث مؤمن تو مؤمن کا آئینہ ہے، تو ہماری بدگمانی کا اثر سامنے والے آدمی کے دل پر آجاتا ہے اور اس کا دل بھی ہمارے لیے سخت ہوجاتا ہے۔

ہماری تو یہ چاہت ہے کہ ہمارے ساتھی جہاں بھی ہوں وہاں لوگوں کو ان سے سکھ پہنچے۔ جیسا کہ حضرت تھانویؒ اپنی خانقاہ کے بارے میں فرماتے تھے کہ

بهشت آن جا که آزار نه باشد

(جنت وہ جگہ ہے جہاں آزار نہ ہو)

حضرت تھانویؒ کی باتوں میں تجدید آداب معاشرت کا کارنامہ بہت خاص ہے ، انھوں نے ایسی معاشرت سکھائی اور برتی کہ بڑے بڑے نوابوں اور بادشاہوں کے درباروں میں بھی نہ ہوتی ہوگی۔ اس لیے جب بڑے بڑے رؤسا کی مجالس میں حضرت تھانویؒ کے لوگ جاتے ہیں تو لوگ ان سے دبتے ہیں اور وہ کبھی فیل ہوکر نہیں نکلتے کیونکہ ان کی آداب معاشرت کی ایسی تربیت ہے۔

اصل میں جو آداب معاشرت ہیں وہی انسانی حقوق ہیں۔ لیکن NGO کے خبیثوں نے ان چیزوں کو انسانی حق قرار دیا ہے جن کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو فحاشی اور بدکاری کی اجازت دینا انسانی حق ہے، اور دوسرا جوان کا ٹارگٹ ہے وہ توہین رسالت ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ بدکاری عام ہو جائے اور توہین رسالت کا قانون ختم ہو جائے۔ یہ لوگ جن چیزوں کو انسانی حقوق (Human rights) کہتے ہیں تو یہ ان کی خباثت ہے اور ایک سازش ہے جو یہ دنیائے اسلام کے خلاف چلا رہے ہیں۔ یہاں ایک NGO نے لڑکیوں کے سکول میں ایک پروفارمہ بھیجا جس میں معصوم بچیوں سے یہ پوچھا گیا تھا کہ تمہارے کتنے لڑکوں کے ساتھ تعلقات ہیں اور کس حد تک ہیں، صرف چھونے کی حد تک ہیں یا چومنے تک وغیرہ۔ میں نے اس کے خلاف کافی ہنگامہ کیا۔ وہ جو عالمی سطح کی عیسائی عورت تھی مدر ٹریسا، اس نے مرتے وقت کہا تھا کہ آئندہ پچاس برسوں میں بنگلہ دیش ایک عیسائی ملک ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے تجھ کو وہ نظام معاشرت دیا ہے جو اور کسی کے پاس نہیں ہے۔ ایک ساتھی کہہ رہے تھے فلاں مغربی ملک میں ایک شخص دیوار میں میخ لگانا چاہتا تھا، ہر روز وہ

پڑوسی کے پاس آتا تھا لیکن وہ اسے ملتا نہیں تھا آخر اس نے ایک خط چھوڑا کہ میں میخ ٹھونکنا چاہتا ہوں اور آپ مجھے اجازت دیں۔ تو دیکھیں کہ کتنے آداب ہیں وہاں! میں نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو پڑوسی اسے دعویٰ کر کے گرفتار کروا سکتا تھا۔ تو وہ یہ آداب اس لیے نہیں برت رہے ہوتے کہ یہ کسی کا انسانی حق ہے بلکہ دنیا کے مفاد کے لیے کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کی مارکیٹوں میں جو دیانت ہے تو اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ اس کے بغیر مال بکتا نہیں ہے اگر وہ اعلیٰ معیار باقی نہ رکھیں تو کاروبار فیل ہو جاتا ہے، جبکہ ہمارے ہاں مقابلہ دھوکے بازی کا ہے۔ تو آسمانی ھدایت کے بغیر آدمی کے سارے کام محض مفاد کے لیے ہوتے ہیں چاہے بظاہر کتنے اچھے نظر آ رہے ہوں۔

دین نے ہم کو جو آداب معاشرت سکھائے ہیں ان کو برتنے سے اللہ کی رضا اور آخرت کا نفع تو حاصل ہوگا ہی لیکن ساتھ ساتھ دنیا بھی سکھ والی ہو جائے گی۔ میں نے لاہور میں ایک کورس میں داخلہ لیا تو وہاں ٹریننگ دینے والی پروفیسر ایک شیعہ عورت تھی، بال کٹے ہوئے اور بے پردہ۔ پہلے تو اس نے میرے کاغذات وغیرہ دیکھ کر داخلہ دینے سے ہی انکار کر دیا۔ آخر کافی دعاؤں کے بعد داخلہ ہوا تو میں نے دل میں یہ سوچ لیا کہ ہماری استاد ہے اور استاد کا حق ہوتا ہے۔ گو کہ یہ دنیاوی علم ہے لیکن ہمارے لیے ذریعہ معاش ہے اس لیے بواسطہ عبادت ہے۔ اعمال کا دارومدار تو نیت پر ہے۔ آدمی اس میں بھی جہاد کی نیت کر سکتا ہے۔ کسان اس نیت سے غلہ کاشت کرے کہ اگر غلہ نہ ہوگا تو مجاہد کیا لڑیں گے۔ درزی اس نیت سے کپڑے سیئے کہ مجاہدین اور عام مسلمانوں کی ضروریات پوری ہوں تو یہ بھی ایک طرح کی جہاد کی نیت ہے۔ خیر اب وہ پروفیسر صاحبہ یہ سوچے کہ یہ داڑھی والا مولوی صاحب کہاں سے آ گیا ہے۔ کچھ دن تک اس نے میرا رویہ دیکھا، ایک دن مجھ کو کلاس میں دیر ہو گئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ دیر کیوں ہوئی تو میں

نے کہا کہ ذرا انارکلی بازار گیا تھا بیوی کے لیے کچھ کپڑے خریدنے تھے۔ تو اس نے کہا کہ آپ نے مجھے بتایا ہوتا تو میں آپ کے لیے خریداری کرتی۔ پھر اس نے کہا کہ میں پانچ وقت کی نمازیں پڑھتی ہوں اور اب تفسیر بھی پڑھنا شروع کی ہے۔ تو ہم نے اس کو آخرت اور قبر حشر کی کوئی بات نہیں کہی تھی لیکن رویہ درست رکھا تھا۔ جبکہ ہمارا ایک اور ساتھی تھا جس نے شروع سے ہی چپقلش کا رویہ رکھا اور آخر دو سال بعد فیل ہو کر آ گیا۔ عام طور پر اس کا یہ رویہ ہوتا کہ فلاں عیسائی ہے، فلاں شیعہ ہے، فلاں کا مسلک ایسا ہے وغیرہ۔

اب بات یہ ہے کہ ایک آدمی پاکستان کا شہری ہے۔ میرا تعلق اس کے ساتھ صرف کام تک کا ہے۔ اگر وہ کام ٹھیک کرے تو کافی ہے، اس کے عقیدے یا اس کی ذاتی زندگی کے ساتھ تو میرا کوئی تعلق نہیں ہے وہ جانے اور اس کی قبر حشر جانے۔

تو یہ صرف ذکر اذکار اور گردن ہلانا نہیں ہے بلکہ دین کے پانچ شعبے ہیں، عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق اور معاشرت۔ ان سب شعبوں کو درست کرنا ہے اخلاق رذیلہ کبر، حسد، لالچ، ریا وغیرہ کو دور کرنا ہے اور اخلاق فاضلہ امثلاً اخلاص تواضع وغیرہ حاصل کرنے ہیں۔ اور پھر معاشرت کو درست کرنا ہے کہ اٹھنا بیٹھنا، لین دین، چلنا پھرنا اور گھر کے حقوق وغیرہ۔ اس دن ایک برخوردار آیا اور کہنے لگا کہ والد صاحب سے جھگڑا ہوا ہے کہ پیسے نہیں دیتے۔ میں نے جواب دیا کہ آپ بالغ ہو گئے ہیں اب ان کے ذمے آپ کو پیسے دینا نہیں رہا۔ اگر وہ کھانا پینا اور جیب خرچ آپ کو دے رہے ہیں تو یہ ان کا احسان ہے اور ان کو خیرات کا ثواب ہو رہا ہے۔ اگر آپ نے ان سے کچھ مانگنا ہے تو عاجزی سے اور خدمت کر کے مانگیں۔ اسی طرح حضرت تھانویؒ نے لکھا ہے کہ شوہر کے والدین کی خدمت کرنا بیوی کے ذمے نہیں ہے۔ نکاح اور مہر کے بدلے جو بیوی کے ذمے فرائض ہیں وہ شوہر کے ازدواجی حقوق اور بچوں کی پرورش ہیں۔ یہاں پر جو دیندار

سے دیندار لوگ ہیں ان کو بھی اس معاشرت کا خیال نہیں آتا۔ عورت کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ ٹیڑھی پسلی ہے اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو اس کو توڑ دو گے۔ حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ یہاں شریعت نے عورتوں کی برائی بیان نہیں کی بلکہ ان کے لیے رعایت حاصل کی گئی ہے کہ ان کی ساری کوتاہیوں کے ہوتے ہوئے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ اگر بیوی شوہر کے والدین کی خدمت کرتی ہے اور کھانا وغیرہ پکاتی ہے تو یہ اس کا احسان ہے اور اس کی قدر کرنا چاہیے۔ یہ نہیں ہے کہ تھوڑا سا کھانے میں نمک کم ہوا تو ناک منہ چڑھالیا اور آدمی برتن توڑ رہا ہے۔ بیوی کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اس کا مکان الگ ہو، اگر پورا مکان نہ ہو سکے تو کم از ایک کمرہ ہی الگ ہو جس کی چابی اس کے پاس ہو اور گھر میں اس کا چولہا الگ ہو جہاں وہ مکمل خودمختار ہو۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ گھروں میں آگ زیادہ تر اس چولہے سے ہی لگتی ہے۔ ہمارے ایک پروفیسر صاحب تھے ان کی شادی ہوئی۔ ان کے چار مکان کرائے پر تھے اور ایک مکان میں سب خاندان والے رہ رہے تھے۔ ان کے گھر میں کافی عورتیں تھیں بعد میں عورتوں کے تعلقات خراب ہو گئے۔ ایک دفعہ ہمارے ساتھ وہ اعتکاف میں بیٹھے تو ان پر اتنی توجہ ہوئی کہ خیال ہو رہا تھا کہ کچھ عرصہ بعد ان کی خلافت ہو جائے گی۔ ان سے میں نے کہا کہ اپنی بیوی کو الگ کر لیں۔ انھوں نے اس بات کو نہیں مانا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ بعد جھگڑوں کی وجہ سے ان کی بہن دماغی مریض، وہ خود اور ان کی بیوی دماغی مریض ہو گئے اور ساری استعداد ختم ہو گئی۔ محض ایک شرعی حکم پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے یہ ساری مصیبت آئی۔ ہمارے یہاں جو ہے وہ رواجی دینداری ہے شرعی دینداری نہیں ہے۔ ہمارے ایک ڈاکٹر صاحب کی شادی ہوئی، ان کے پاس یہاں ہاسٹل میں ایک کمرہ تھا اور ساتھ ایک چھوٹا سا برآمدہ۔ اس میں دو یہ اور ساتھ اس کے والدین اور والدین نے دوسرے بیٹے کو

بیوی بچوں سمیت بلالیا کہ ہماری خدمت اس کی بیوی نہیں کرتی وہ کرتے ہیں۔اب وہاں پر خاوند نے بیوی کو ایک چارپائی دے دی کہ اس پر تیرا حق ہے۔ کچھ عرصہ ہنگامے اور جھگڑے ہوئے تو بیوی روٹھ کر چلی گئی۔انہی دنوں میں نے اپنی کتاب ''اصلاح نفس'' تقسیم کی تھی جس میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ نہ تو ماں باپ کی خاطر آدمی بیوی کے حقوق ضائع کرے اور نہ ہی بیوی کی خاطر ماں باپ کے۔اچھا ان ہی دنوں سسر نے بہو کی پٹائی بھی کی تھی، کیونکہ سسر یہ سمجھتا ہے کہ باقی حقوق کے ساتھ ساتھ ایک میرا حق بہو کی پٹائی کرنے کا بھی ہے۔حالانکہ پٹائی کا حق تو خاوند کو بھی نہیں ہے۔آدمی بیوی کو صرف نماز ترک کرنے پر مار سکتا ہے اور میلا کچیلا رہنے پر مار سکتا ہے۔کہ عورت جب باہر جا رہی ہو تو خوب بن سنور کر جائے اور گھر میں میلی کچیلی رہے تو اس پر مار سکتا ہے۔کھانے کے نمک پر پٹائی نہیں کر سکتا۔اور پٹائی کا طریقہ بھی یہ ہے کہ پتلی شاخ سے پنڈلیوں اور رانوں پر اتنا مارے کہ نشان نہ پڑے اور ہڈی نہ ٹوٹے۔یہ پٹائی بھی جائز ہے بہتر نہیں ہے۔آدمی کی نااہلی کا ثبوت ہے کہ وہ بات پٹائی تک لے آئے۔

تو معاشرت دین کا ایک پورا شعبہ ہے۔حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے آداب معاشرت پر ایک پوری کتاب لکھی ہے۔جو ساتھی زیادہ سیکھنا چاہیں وہ اس کا مطالعہ بھی کر لیں۔

☆☆☆☆☆

اے ابن آدم! اگر تو نے بذات خود اپنی نجات اخروی کے لئے تیاری نہ کی تو تیری بجائے کوئی دوسرا شخص آ کر تیری نجات کے لیے کچھ نہیں کرے گا۔

(حضرت عثمانؓ)

ایس۔امین

برائی کا برائی سے خاتمہ؟

۱۹۸۲ء کا سال تھا، میں ڈگری کالج سوپور میں زیرِ تعلیم تھا، کسی حد تک اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کیا تھا جس سے اسلام اور اس کے آفاقی نظام کے ساتھ گہری وابستگی پیدا ہوئی تھی۔ کالج سیکرٹری ہونے کی حیثیت سے ملازمین، اساتذہ اور طلباء کے ساتھ اکثر رابطہ رہتا تھا۔ موجودہ حریت رہنما پروفیسر اشرف صراف صاحب ان دنوں وہاں بحیثیت استاد اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ کالج کے ایک کلرک سے کچھ قربت سی پیدا ہوئی۔ وہ نہ صرف کالج کا ملازم تھا بلکہ لوپیڈ ایمپلائز فیڈریش کا ریاستی عہدیدار بھی تھا، مارکسی نظریات کا حامی تھا اور اپنے اِس حقیقی روپ کو چھپانے کا قائل نہیں تھا۔ وہ نظامِ شمسی کے نام سے معروف تھا جبکہ اصل نام سید غلام نبی قادری تھا۔ اُن کے والد اپنے علاقے کی ایک زیارت کے سجادہ نشین تھے۔ میں حیران تھا کہ ایک وراثتی مذہبی خاندان سے تعلق رکھنے والا سید غلام نبی مارکسی نظریات کی بھینٹ کس طرح چڑھا۔ میں نے اِس کے قریب جا کر معاملہ سمجھنے کی کوشش کی۔ میری کوشش کامیاب رہی، لیکن معاملہ سمجھنے کے بعد شرمندگی محسوس ہوئی۔ جب بھی سید غلام بنی المعروف نظام شمسی کا خیال دل میں آتا ہے تو شرمندگی کا احساس اسی دم جاگ اُٹھتا ہے۔

جب میں نے اُس سے پوچھا کہ آپ اسلام کی نعمت کو چھوڑ کر کیسے کمیونزم کی نذر ہو گئے۔ نظامِ شمسی جو بہت ہی منہ پھٹ اور باغی مزاج رکھنے والا انسان تھا، بول اُٹھا امین بھائی! مجھے اسلام سمجھانے کی ضرورت نہیں، میں خود اِس خاندان سے تعلق رکھتا ہوں جہاں سے آپ کو اسلام سمجھایا جاتا ہے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد میری طرف دیکھے بغیر بولنا شروع کر دیا، میں جب آپ کی طرح طالب علم تھا تو اپنی گاڑی میں کالج جایا کرتا

تھا، میری شامیں بہت رنگین ہوا کرتی تھیں ۔ بڑے بڑے مہنگے ہوٹلوں میں جایا کرتا تھا۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد والدین کے بھرپُور اصرار پر شادی کرنی پڑی ، شادی بھی ایک بہت بڑے پیر کے ہاں قرار پائی ۔ والدین کا اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے دھوم دھام سے شادی ہوئی۔

شادی کرنے کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھا تو مجھے پہلی بار بڑی شدت سے احساس ہوا کہ لوگ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کیلئے کیا کچھ جتن کرتے ہیں۔

یکلخت میرا ضمیر جاگ اُٹھا، میرے سامنے ہزاروں چہرے گھومنے لگے جو مفلوک الحال تھے۔ جن کے پاؤں میں پہننے کے لئے جوتی نہ تھی اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس تھے لیکن یہی لوگ مذہب کے نام پر، زیارت کے نام پر اثاثے فروخت کر کے ہماری جھولی بھر دیتے ہیں۔ نذرانے کے نام پر یہ لوگ اپنے مال و جائداد کا اکثر حصہ میرے والد صاحب کے قدموں تلے نچھاور کرتے تھے۔ خود بھوکے رہتے تھے، لیکن ہمیں ہوٹلوں میں کھانے پینے کا شوق پورا کرنے کا موقع فراہم کر رہے تھے، خود ننگے پیر چلتے تھے پیدلِ سفر کرتے تھے، لیکنِ پیر صاحب کے لئے گاڑی فراہم کر رکھی تھی۔ میں خیالات کی دنیا میں شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ اپنے آپ کو اس بھکاری سے بدتر سمجھنے لگا، جو سڑک پر بھیک مانگ کر اپنے اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا ہے، میں نے اس کو اپنے سے عظیم سمجھا کہ وہ اپنی اصلی حیثیت سامنے لاکر مانگتا ہے۔ ہم لوگ مذہب اور دین کا لبادہ اوڑھ کر لوٹ مچا رہے ہیں۔ میں نے اس لوٹ مار کو بند کرنا اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا۔ میں اب گم صم رہتا تھا۔ کئی ہفتے گزر گئے، عرس کے دن قریب آئے ، ہمارے کوٹھی نما بنگلے میں تقریبات کا سلسلہ شروع ہوا، پوری وادی سے سادہ لوح عقیدت مندوں نے آنا شروع کیا۔ ختمات المعظمات کی محفلیں شروع ہوئیں۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور عین اسی موقع پر جبکہ محفل

شباب پر تھی، میں نے شراب کی بوتل نکالی اوراس ہال میں داخل ہوا جہاں نعت ومنقبت ہو رہی تھی۔ میں نے بوتل کا ڈھکن کھولنے کے بعد غنا غٹ شراب کے چند گھونٹ خلق میں انڈیل دیئے، پھر فلمی انداز میں ناچنے اور گانے کا ناٹک رچایا۔ محفل کے رنگ میں بھنگ پڑ گئی، بھاگم دوڑ شروع ہوئی۔ والد صاحب اور سُسر صاحب شرمندگی سہہ نہ سکے اور بے ہوش ہو گئے۔ پوری زیارت عالیہ میں اس واقعہ کی گونج سنائی دی۔ ہر ایک کی زبان پر آیا کہ پیر صاحب کے بیٹے نے شراب پی لی۔

امین صاحب! آپ شاید یقین نہ کریں گے۔ تب سے اب تک ایک بھی شخص ہمارے ہاں نہیں آیا۔ گاڑی بیچنی پڑی، ہیرے جواہرات بیچنے پڑے، غربت و مفلسی نے اپنا چہرہ دکھایا۔ والد صاحب برداشت نہ کر سکے، کچھ دنوں کے بعد وہ وفات پا گئے چونکہ بی۔ اے کیا ہوا تھا۔ اس وجہ سے سرکاری کلرک کے عہدے پر فائز ہوا۔ اب اسی محدود آمدنی سے گھر کا گزارا چلا رہا ہوں، اپنے آپ پر فخر کرتا ہوں کہ کم از کم مذہبی بھیک مانگنے سے نجات مل گئی۔

یہ دلدوز واقعہ سُن کر میں لرز اُٹھا، کچھ کہنے کی سکت نہ رہی، برائی سے برائی کا خاتمہ بظاہر کچھ اچھا نہ لگا۔ لیکن شمسی کے پاس اور چارا ہی کیا تھا۔ جس مذہب سے وہ متعارف ہوا تھا اِس مذہب سے اگر چہ اسلام کا کوئی تعلق نہیں لیکن اِسے یہی اسلام سمجھایا گیا تھا، اِس نے اِسی اسلام کے ماننے والوں کا عمل دیکھا تھا۔ سید غلام نبی قادری کو اِسی اسلام نے اپنا اسلامی نام ترک کرنے پر مجبور کیا تھا۔ مذہب اور دین کو اپنے اغراض و مقاصد کی خاطر استعمال کرنے والے نہ صرف خُدا کے مجرم ہیں بلکہ وہ سید غلام نبی جیسے ہزاروں نوجوانوں کے بھی مجرم ہیں۔

آج ہم اپنے معاشرے پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں بہت سے اِیسے چہرے نظر آئیں

گے جو علماء و صلحاء کا بہروپ بدل کر اپنی دکانیں چمکا رہے ہیں۔ یہ عناصر نہ صرف دین کی آڑ میں اپنے مفادات کی تکمیل کرتے ہیں بلکہ اِن کے اِس گھناؤنے کاروبار سے دینی طبقے پر قائم عوام کے اعتماد کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے کہ اِن عناصر کا علماء حق سے دور کا بھی تعلق نہیں اور نہ ہی اِن کے طور طریقوں کو سنت و شریعت سے کوئی مطابقت ہے مگر اِس کے باوجود عوام کی سادہ لوح اکثریت اِس فرق کو پہنچاننے سے قاصر ہے عوام کے خون پسینے کی کمائی پر اپنی خواہشات کا تاج محل تعمیر کرنے والوں کو بھلا اِن اللہ والوں سے کیا مناسب ہے جو اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر دوسروں کو کھانا کھلاتے ہیں اور خود زخم سہہ کر دوسروں کے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں۔ آج درحقیقت علماء حق اور حاملین شریعت کا یہی وہ طبقہ ہے جس کے دم قدم سے اِس فساد زدہ دور میں بھی دین اسلام کی حقیقی تعلیمات اور سچی تصویر نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے پائی۔

(بشکریہ روزنامہ اسلام۔ انتخاب نثار احمد)

☆☆☆☆☆

ایک شخص اپنے دوست کے مکان پر اس سے ملنے گیا، دروازہ کھٹکھٹایا تو اس نے اندرون مکان ہی ملازم سے کہا کہ یوں کہہ دو کہ وہ نہیں ہے، اور اتنی زور سے کہا کہ اس شخص نے دروازہ پر اس کی آواز کو سن لیا۔ ملازم نے آکر کہہ دیا کہ وہ نہیں ہے، اس پر وہ واپس آگیا۔ کسی روز یہ دوست اس شخص کے پاس گیا تو خود اس نے اندر سے ہی بآواز بلند کہہ دیا کہ وہ نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ عجیب بات ہے کہ خود بول رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ ہم نے تمہارے خادم کا بھی اعتبار کرلیا تھا، اور تم ہمارا بھی اعتبار نہیں کرتے؟ عجیب بات ہے۔

حضرت مولانا زکریاؒ

ائمہ مجتہدین متبوعین کا چار میں انحصار

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ عقدالجید میں فرماتے ہیں۔اس کا ترجمہ یہ ہے۔

''جان! کہ ان مذاہب اربعہ کے اختیار کرنے میں بڑی مصلحت ہے۔اوران چاروں سے نکلنے میں بڑا مفسدہ (بڑی خرابی) ہے جس کو ہم دلائل سے بیان کرتے ہیں۔ اوّل یہ کہ امت اس بات پر متفق ہے کہ شریعت کے جاننے میں سلف پر اعتماد کرے۔اسی وجہ سے تابعین نے اس بارے میں صحابہؓ پر اعتماد کیا اور تبع تابعین نے تابعین پر اعتماد کیا۔ اسی طریقہ سے ہر طبقہ کے علماء نے اپنے سے پہلوں پر اعتماد کیا اور عقل بھی اس کے اچھے ہونے پر دلالت کرتی ہے۔کیونکہ شریعت نقل اور استنباط ہی سے معلوم ہوسکتی ہے اور نقل اسی وقت صحیح ہوسکتی ہے کہ ہر طبقہ اپنے سے پہلے والوں سے اتصال کے ساتھ حاصل کرے اور استنباط میں ضروری ہے کہ متقدمین کے مذاہب کو جانے تاکہ ان سے نکل کر اجماع کو توڑنے والا نہ بنے اور ان ہی پر اپنے قول کی بنأ رکھے اور اس بارے میں ہر طبقہ اپنے سے پہلے والے سے مدد لے۔کیوں کہ صناعتیں جیسے صرف، نحو، طب، شعر، آہنگری، نجّاری، رنگریزی وغیرہ کسی کے لیے اس وقت تک آسان نہیں ہوتیں جب تک وہ ان کے اہل کے ساتھ نہ رہے۔اور اس کے خلاف اگرچہ عقلاً ممکن ہے مگر نادرالوقوع ہے اور جب سلف کے اقوال پر اعتماد متعین ہوگیا تو یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے معتمد اقوال اسناد صحیح کے ساتھ مروی ہوں اور مشہور کتب کے اندر مدون ہوں اور ان پر علماء کی طرف سے شروح و بعض مواقع میں عام کو خاص اور بعض مواقع میں مطلق کو مقید کیا گیا ہو اور اس سے احکام کی علت بیان کی گئی ہو۔اگر یہ باتیں نہ ہوں تو ان پر اعتماد صحیح نہ ہوگا اور اس زمانہ میں کوئی مذہب (اہل سنت وجماعت کے) مذاہب اربعہ کے علاوہ اس صفت کے ساتھ متصف نہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سواد اعظم (بڑی جماعت) کا اتباع کرو اور جب تمام مذاہب فقہ مذاہب اربعہ کے علاوہ ختم ہو گئے تو اب مذاہب اربعہ کا اتباع ہی سواد اعظم کا اتباع ہو گا اور ان سے نکلنا سواد اعظم سے نکلنا ہو گا۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ زمانہ دراز گذر جانے اور امانتداری ضائع ہو جانے کی وجہ سے علماء سوء پر اعتماد کرنے کا کوئی راستہ نہیں رہا۔ یہ لوگ ان حضرات کی طرف غلط باتیں منسوب کر سکتے ہیں جن کا صدق اور امانت داری مشہور ہے اور یہ وسائط چونکہ قابل اعتماد نہیں ہیں۔ اس لیے ان کی روایات قبول نہیں کی جاسکتی ہیں۔ رہا مسئلہ ائمہ اربعہ کے مذاہب کا سوان کی پابندی اس لیے ضروری ہے کہ ان کے مذاہب مدون ہیں اور ان کی کتابیں قابل قبول اور معتبر ہیں۔ اس وجہ سے ان کی طرف غلط باتیں منسوب نہیں ہوسکتی ہیں۔'' (عقد الجید ص ۱۴)

مفتی محمد شفیع صاحبؒ جواہر الفقہ ص ۱۳۱ ج ۱، اس سوال کے جواب میں کہ تقلید صرف ائمہ اربعہ ہی کی کیوں کی جاتی ہے؟ کیا کوئی دوسرا امام اس درجہ کا نہیں ہوا جس کی تقلید کی جائے اور کیا ائمہ اربعہ کی تقلید کا حکم کسی نص میں وارد ہوا ہے؟ تحریر فرمایا ہے کہ ائمہ اربعہ پر سلسلہ تقلید ختم ہونا کوئی امر عقلی یا شرعی نہیں بلکہ محض اتفاقی ہے۔ کہ مشیت خداوندی سے ان چار مذاہب کے سوا اور جتنے مذاہب تھے مندرس ہو گئے اور مٹ کر کَاَنْ لَمْ یَکُن ہو گئے۔ دو چار۔ دس بیس یا پچاس، سو اقوال و احکام اگر آج ان کے منقول اور موجود بھی ہوں تو وہ کوئی مستقل مذہب نہیں بن سکتا کہ لوگ اس کی تقلید کیا کریں کیونکہ اگر ان سو پچاس احکام میں ان کی تقلید کر بھی لو تو باقی ہزاروں مسائل میں کیا کریں گے۔ اب جب کہ دیکھا گیا کہ کل مذاہب سوائے ان چار مذہبوں کے مندرس ہو گئے تو ناچار سلسلہ تقلید ان ہی میں منحصر ہو گیا۔ چنانچہ ابن خلدون اپنے مقدمہ تاریخ میں ظاہریہ کے مذاہب پر

کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ثم درس مذهب اهل الظاهر اليوم بدروس ائمة و انكار الجمهور على منتحليه ولم يبق الافى الكتاب المجلده

مفتی صاحب نے صرف عربی عبارت لکھی ہے۔اس کا ترجمہ یہ ہے۔

پھر اہل ظاہر کا مذہب اس زمانہ میں مٹ گیا ان کے ائمہ کے ختم ہو جانے کی وجہ سے اور جمہور کے ان کے مقلدین پر انکار کرنے کی وجہ سے اور صرف کتابوں ہی میں اس کا وجود رہ گیا۔

اور اسی میں یہ بھی مصرح ہے:۔

ووقف اليقليد فى الا مصار عند هؤلاء الا ربعةودرس المقلدون بمن سواهم الخ

یعنی تمام علاقوں میں ان ہی ائمہ اربعہ کی تقلید برقرار رہی اور دوسرے ائمہ مجتہدین کی تقلید کرنے والے سب ختم ہو گئے اور اسی پر سب متفق ہو گئے اس میں کوئی اختلاف نہیں رہا۔ جب علوم میں مختلف اصطلاحات کی کثرت ہوئی اور مرتبہ اجتہاد تک پہنچنا (عدم وجود شرائط کی وجہ سے) مشکل ہو گیا اور جب اجتہاد کے غیر مستحق کی طرف منسوب ہونے کا خوف ہوا اور ایسے لوگوں کی طرف جن کے دین اور جن کی رائے پر اعتماد نہ کیا جا سکے تو علماء نے عجز عن الاجتہاد کی تصریح کر دی اور لوگوں کو ائمہ اربعہ میں سے کسی خاص ایک کی تقلید کا پابند کر دیا اور دو اماموں کی بیک وقت تقلید سے منع کر دیا کہ یہ تلاعب اور تلفیق ہے۔اور غیر متبوع ائمہ کے مسائل کی صرف کتابوں میں نقل ہی رہ گئی ان کی فقہ کی اپنی کتابیں مستقل طور پر مدون نہیں اور ہر مقلد نے اپنے امام کے مذہب پر عمل کرنا تصحیح اصول اور اتصال سند کے بعد شروع کر دیا۔اور فقہ کا حاصل اس زمانہ میں سوائے اس کے

یعنی اپنے امام کی تقلید کے اور کچھ نہیں رہا اور اب اس زمانہ میں اجتہاد کے مدعی کا دعوٰے نا قابل تسلیم ہے اور اس کی تقلید مہجور و متروک اور اہل اسلام اس زمانہ میں ائمہ اربعہ کی تقلید پر متفق ہو گئے۔ اور شیخ ابن ہمام فتح القدیر میں فرماتے ہیں:

انعقد الا جماع علی عدم العمل بالمذاھب الخالفة للا ئمه الا ربعه

ائمہ اربعہ کے علاوہ مذاہب پر عمل نہ کرنے پر اجماع منعقد ہو گیا۔

اور علامہ ابن حجر مکی فتح المبین شرح الاربعین میں فرماتے ہیں:

امانی زماننا فقال ائمتنا لا یجرز تقلید غیر الائمة الا ربعة الشافعی و مالک و ابی حنیفة و احمد بن حنبل

اور رہا ہمارے زمانہ میں تو ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ ائمہ اربعہ امام شافعی، امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام احمد بن حنبل کے علاوہ کسی کی تقلید جائز نہیں۔

اب کسی کا اس پر یہ دلیل طلب کرنا کہ تقلید چار میں کیوں منحصر ہو گئی محض بے محل ہے اور بالکل ایسا ہے کہ ایک شخص کی اولاد کثیر ہو لیکن وہ مرتے رہیں۔ یہاں تک کہ جب باپ کا انتقال ہو تو چار بیٹوں کے سوا اور کوئی باقی نہ رہے۔ اب ظاہر ہے کہ تقسیم میراث ان ہی چار میں منحصر ہو گی۔ حالانکہ اولاد ان کے سوا اور بھی تھی لیکن آپ نے کسی کو نہ کہتے نہ سنا ہو گا نہ میراث ان ہی چار میں کیوں منحصر ہو گئی اور جو کوئی کہے تو اس کا جواب اور کیا ہو سکتا ہے کہ مشیت ایزدی یہی تھی۔ ملا جیون صاحبؒ نے تفسیر احمدی میں لکھا ہے:

والانصاف ان انحصار المذاھب فی الاربع فضل الٰھی و قبولیة من عند اللہ تعالٰی لا فیھا للتوجیھات و الادلة.

انصاف یہ ہے کہ مذاہب کا چار میں انحصار محض فضل اور قبولیت من عند اللہ ہے۔ اس میں دلائل اور توجیہات کی کوئی گنجائش نہیں۔ (جواہر الفقہ)

ماخوذ از کیمیائے سعادت
از حجۃ الاسلام امام غزالیؒ

حج کی عبرتیں

اس سفر کو اللہ تعالیٰ نے سفر آخرت کی مانند بنایا ہے کیونکہ اس سے مقصود ایک گھر ہوتا ہے تو اس سفر سے اس کے حالات و مقدمات معلوم کرنے چاہئیں۔ جب آدمی اپنے اہل و عیال اور دوست احباب سے رخصت ہو تو یہ سمجھے کہ یہ رخصت اُس رخصت کی مانند ہے جو سکرات الموت میں ہوگی۔ اور اس سفر سے پہلے تمام تعلقات سے فارغ ہوکر آدمی نکلتا ہے اسی طرح آخری عمر میں بھی چاہیے کہ تمام دُنیا سے دِل کو خالی کرے ورنہ سفر آخرت اس کیلئے مشکل ہو جائے گا۔ اور جب اس سفر کیلئے توشہ اور زادِ راہ مہیا کرتا ہے اور ہوشیار ہوکر ہر طرح احتیاط کرتا ہے کہ راستہ میں کہیں تکلیف نہ ہو تو اسی طرح خیال کرنا چاہیے کہ میدانِ حشر بہت بڑا اور ہولناک میدان ہے اور وہاں توشہ زادِ آخرت کی سخت محتاجی ہوگی۔ اور جیسے اس سفر میں وہ چیز اپنے ساتھ نہیں لیتا جو بہت جلد خراب ہونے والی ہوتی ہے کیونکہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا ساتھ نہ دے گی اور یہ توشہ زادِ سفر کے لائق نہیں اسی طرح جس عبادت میں ریا اور قصور شامل ہو اس کے متعلق خیال کرے کہ یہ آخرت کے توشہ کے قابل نہیں۔ اور جب سواری پر سوار ہو تو جنازہ کو یاد کرے کیونکہ جانا تو ہے ہی اور سفر آخرت میں سواری بھی ہوگی اور ممکن ہے کہ سواری سے اُترنے کا موقع نہ ملے اور جنازہ کا وقت آجائے بہر حال چاہیے کہ یہ سفر حج سفر آخرت کا نمونہ بن سکے اور جب احرام کے کپڑے تیار کرے اور مکہ کے نزدیک پہنچتے ہی روزمرہ کے کپڑے اتار کر انہیں پہنے گا اور ظاہر ہے کہ وہ دو سفید چادریں ہیں تو اس وقت کفن کو یاد کرے کہ وہ بھی تو دُنیا کے لباس سے مختلف ہے۔ اور جب پہاڑ کی گھاٹیاں اور جنگل نظر آئیں تو نکیرین اور قبر کے سانپ بچھو یاد کرے کیونکہ قبر سے میدان حشر تک بہت بڑا جنگل ہے اور اس میں ان گنت گھاٹیاں

ہیں اور جس طرح بغیر رہبر جنگل کی آفتوں سے بچنا ممکن نہیں اسی طرح عبادت کے بغیر قبر کے ہولناک ماحول سے بچنا ممکن نہیں اور جیسے جنگل میں اہل وعیال اور دوست احباب سے الگ تھلگ اور تنہا ہوتا ہے قبر میں بھی اسی طرح تنہا ہوگا۔ اور جب تلبیہ (لبیک) کہنا شروع کرے تو یہ محسوس کرے کہ اللہ تعالیٰ کی صدا و ندا کا جواب ہے، یاد رہے کہ قیامت کے دن اسی طرح صدا ہوگی اسی ہولناک ماحول کا خیال کر کے اس کے تصورات میں ڈوبا رہے۔ علی بن حسینؓ کا چہرا احرام کے وقت زرد ہو جاتا تھا اور بدن میں لرزہ پڑ جاتا تھا اور تلبیہ کہنا مشکل ہو جاتا۔ لوگوں نے تلبیہ نہ کہنے کی وجہ معلوم کی تو فرمایا کہ میں ڈرتا ہوں کہ جواب میں کہیں لا لبیک ولا سعدیک نہ کہا جائے یہ کہا اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اور حضرت ابن الحواریؒ جو حضرت ابوسلیمان دارانیؒ کے مرید تھے وہ حکایت بیان کرتے ہیں کہ ابوسلیمانؒ نے اس وقت لبیک نہ کہا اور ایک میل چل کر آپ کو غش پڑ گیا جب ہوش آیا تو فرمایا حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ پر وحی نازل کی کہ اُمت کے ظالموں سے کہہ دے کہ نہ تو مجھے یاد کریں اور نہ ہی نام نہ لیں کیونکہ جو مجھے یاد کرتا ہے میں اسے یاد کرتا ہوں اور جب یاد کرنے والے ظالم ہوں تو میں انھیں لعنت کے ساتھ یاد کرتا ہوں اور فرمایا کہ میں نے سنا ہے کہ جو کوئی حج میں مشتبہ مال خرچ کرتا ہے اور لبیک کہتا ہے اس کو جواب یوں دیا جاتا ہے **لَا لَبَّيْکَ وَلَا سَعْدَيْکَ حَتّٰى تَرُدَّ مَا فِیْ يَدَيْکَ.** (یعنی نہ تو تمہاری حاضری قبول ہے اور نہ ہی تمہارے لیے سعادت ہے جب تک کہ مال حرام کو واپس نہ کر دو)۔

رہ گئے طواف اور سعی تو ان کی حیثیت یہ ہے جیسے غریب ولاچار لوگ سلاطین کے دروازوں پر جاتے ہیں اور محل کے اِردگرد چکر لگا کر فریاد کا موقع تلاش کرتے ہیں اور جلو خانے میں آتے جاتے اپنے لیے سفارش تلاش کرتے ہیں اور انھیں اُمید ہوتی ہے کہ شاید بادشاہ کی نگاہ پڑ جائے اور وہ ایک نظر ہمیں دیکھ لے، صفا و مروہ کے بیچ کا میدان بادشاہی

جلوخانے کی مانند ہے جبکہ عرفات پر کھڑا ہونا اور اِدھر اُدھر سے لوگوں کا وہاں اکٹھا ہونا اور مختلف زبانوں میں دُعائیں مانگنا قیامت کے حالات کی مانند ہے وہاں بھی تمام جہان کے لوگ اکٹھے ہوں گے ہر کسی کو اپنی فکر ہوگی اور ہر شخص اُمید وخوف کا شکار ہوگا کہ میں مقبولِ بارگاہِ حمد بنتا ہوں یا مردود! رہ گئے رمی کے پتھر تو اس سے فقط بندگی کا اظہار مقصود ہے اور حضرت ابراھیم خلیل اللہؑ سے مشابہت ہے کہ اس جگہ ابلیس نے آپ کے سامنے آ کر وسوسہ ڈالنے کی کوشش کی تو آپ نے پتھر مارے اگر تمہارا خیال ہو کہ شیطان انھیں تو نظر آیا تھا ہمیں نظر نہیں آیا اس لئے ہم بے فائدہ و بے مقصد پتھر کیوں ماریں تو اس خطرہ کو شیطانی وسوسہ سمجھ کر بے تامل پتھر مارو اور شیطان کی پیٹھ توڑو کیونکہ پتھر مارنے سے اس کی کمر ٹوٹتی ہے اور تجھے تو فرمانبردار بندہ ہونا چاہیے کہ جو حکم ہوا ہے اسے بجالائے اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے تصرف واختیار میں دے دے اور یہ یقین کرے کہ پتھر مارنے سے تو نے شیطان کو مقہور ومغلوب کر لیا۔

حج کے سلسلہ میں عبرتوں کا بیان اسی قدر کافی ہے کیونکہ اگر کوئی شخص اس راہ کو پہچان گیا تو اسے یہ معانی وحالات دکھائی دیں گے اور جن کا ذہن روشن اور شوق کامل ہوگا اور اس کی سعی وکوشش جتنی ہوگی اتنا ہی اس پر حقائق زیادہ روشن ہوں گے اور وہ ہر معاملہ میں حصّہ اور نصیبہ پائے گا۔ اور حقیقت میں یہی عبادت کی رُوح ہے اور جب یہ باتیں معلوم ہوں گی تو ظاہری صورتوں سے معنوی حقائق کی طرف بڑھنا آسان ہوگا۔

☆☆☆☆☆

سب سے زیادہ بدنصیب وہ ہے جس کو طویل عمر ملی لیکن اس نے آخرت کے لیے کچھ نہ کیا۔ (حضرت عثمانؓ)

حج کے اسرار کا بیان

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ شریف کی فضلیت حج کے سلسلہ میں جو کچھ بیان ہوا یہ اس کے ارکان واعمال تھے لیکن ان میں سے ہر رکن میں ایک بھید اور راز ہے اور ہر ایک کی ایک حقیقت ہے۔اس سے مقصود عبرت اور آخرت کی یاد ہے۔حقیقت یہ ہے کہ آدمی اس طرح کی مخلوق ہے کہ وہ جب تک اپنا اختیار اپنے مالک کے سپرد کرکے دے سعادت کی انتہا کو پہنچنا بہت مشکل ہے جیسا کہ کتاب کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔خواہشات کی پیروی بندہ کے لیے موجب ہلاکت ہے۔جب تک اپنے اختیار میں ہو اس کا کوئی کام شریعت کے حکم سے نہیں ہوتا بلکہ وہ خواہش کی متابعت بن جاتی ہے اور اس کا کوئی بھی کام بندگی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا اور بندگی کے سوا کسی کام میں انسان کی سعادت نہیں۔یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ ملتوں میں ہر اُمت کو رہبانیت اور سیاحت کا حکم فرمایا یہاں تک کہ عبادت

کرنے والے آبادی سے نکل جاتے۔مخلوق سے تعلقات منقطع کر لیتے اور پہاڑوں میں جا کر ساری عمر مجاہدہ اور ریاضت میں گزار دیتے۔ جناب رسالت مآب ﷺ سے لوگوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ ہمارے دین میں سیاحت اور رہبانیت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں اس کے عوض اللہ تعالیٰ نے ہمیں جہاد اور حج کا حکم دیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے رہبانیت کی جگہ اس اُمت کو حج کا حکم دیا کیونکہ اس میں مجاہدہ کا ثواب بھی حاصل ہوتا ہیاور عبرتوں کا سامان بھی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نیعطا فرمائی ہے اور اپنی طرف اس کی نسبت کی اورا س کو بادشاہوں کے درِ دولت کی مانند بنایا۔اس کے اطراف و جوانب کو محترم ٹھہرایا اور اس کی تعظیم کی خاطر وہاں کے شکار اور درختوں کو حرام کر دیا اور میدان عرفات کو شاہی درِ دولت کے جلوہ خانے کی مانند حرمکے سامنے بنایا تا کہ تمام اطراف سے بیت اللہ سامنے ہو اور ہر طرف سے اس کا ارادہ وقصد کیا جا سکے۔حالانکہ یہ بات معلوم اور طے شدہ ہے کے اللہ تعالیٰ مکانیت اور خانہ کعبہ میں رہنے سے منزہ اور پاک ہے لیکن آدمی کا شوق جب بے انتہا ہو اور اس کی آرزو حد سے زیادہ ہو تو جو چیز دوست کی طرف منسوب ہوتی ہے وہ جان و دِل سے بھی زیادہ مرغوب نظر آتی ہے۔مسلمانوں نے اسی شوق میں اپنے اہل و عیال اور مال وطن کو ترک کیا اور جنگلوں اور بیابانوں کے خطرات برداشت کرتے ہوئے غلاموں کی طرح سچے دوست اور مالک مطلق کے آستانۂ عالیہ کا قصد و ارادہ کر لیا اور اس عبادت میں انھیں ایسے کاموں کا حکم ہوا جو بظاہر عقل میں آتے جیسے پتھر پھینکنا صفا و مروہ پر دوڑنا اور یہ اس لیے کہ جو چیزیں وعقل میں آجاتی ہیں ان کیساتھ انسانی نفس بھی کسی نہ کسی درجہ میں مانوس ہو جاتا ہے۔کیونکہ اس کام اور اس کی وجوہات کو جب جان لیتا ہے تو اُنس ہو ہی جاتا ہے مثلاً ایک آدمی جانتا ہے کہ زکوٰۃ کے زریعہ محتاجوں کی مدد ہوگی اور نماز میں معبودِ حقیقی کے سامنے فروتنی اور عاجزی ہوگی۔روزہ شیطانی لشکر کی شکست کا سامان ہے۔

ممکن ہے کہ آدمی کی طبعیت عقل کے موافق حرکت کرے لیکن کمالِ بندگی یہ ہے کہ بندہ محض اللہ کے حکم سے کام کرے اوراس کے باطن میں اس کام سے اور کوئی خواہش نہ ہو۔ پتھر پھینکنا اور دوڑنا (سعی) اس قسم کے افعال ہیں کہ عبادت و بندگی کے سوا اور کوئی وجہ نہیں جس کے لیے یہ آدمی کام کرے اسی واسطے جناب روسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: لبیك لحجة حقا تعبدا او رقا۔

گویا آپ نے بلخصوص حج کی شان میں یہ فرمایا اور عبودیت و بندگی اس کا نام تجویز فرمایا۔ بعض لوگ جو حیرانی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ حج کے اعمال سے مقصد کیا ہے تو یہ حیرانی دراصل ان کی غفلت کے بعث ہوتی ہے وہ حقیقت حال سے بے خبر ہوتے ہیں کہ اس کا مطلب یہی ہے کہ یہاں کوئی مطلب نہیں اوراس سے غرض بے غرضی ہے تاکہ محض عبادت کا رنگ ظاہر ہو اور بندہ کی نظر محض اللہ تعالیٰ کے حکم پر ہو جو اس کا مالک ہے اس میں طبیعیت اور عقل کا کسی طرح دخل نہ ہو تاکہ آدمی اپنے آپ کو باقی مطلق جل وعلی مجدہ کے لیے فنا کر دے کیونکہ نیستی اور بے نصیبی میں ہی آدمی کی سعادت ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اوراس کے حکم کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہے۔